راہِ رواں

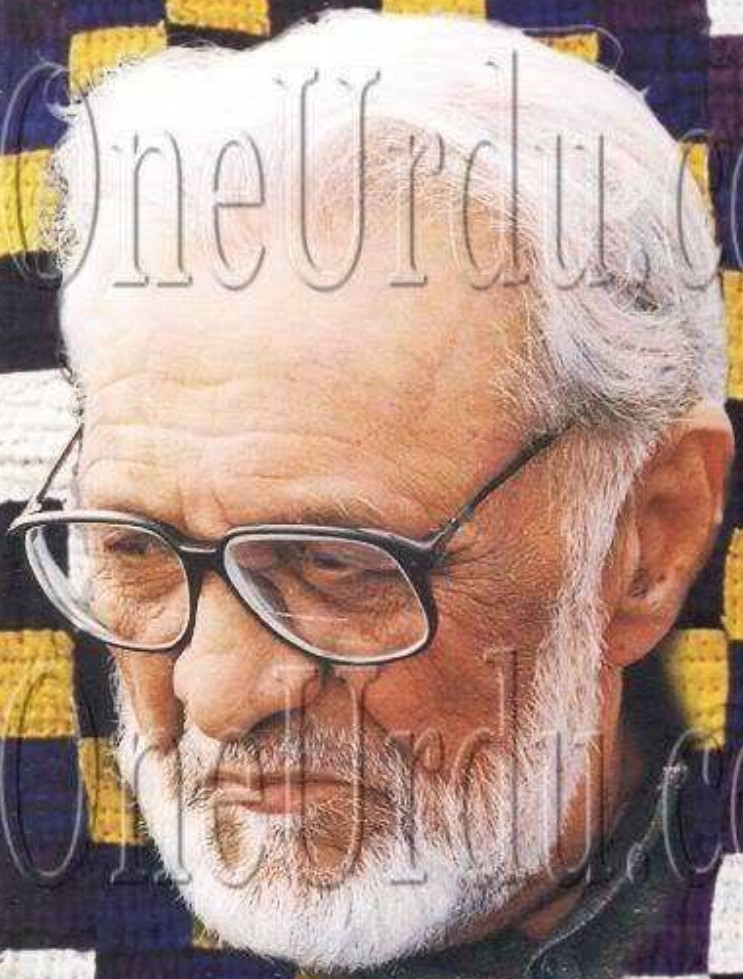

بانو قدسیہ

OneUrdu.com

راہِ رواں

راہِ رواں

بانو قدسیہ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.5 Bano Qudsia
Raah-e-Rawaan / Bano Qudsia.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2011.
636 + 55pp. : with pictures.
1. Urdu Literature - Biography.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2011

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2315-6
ISBN-13: 978-969-35-2315-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

انیق — انیس — اثیر احمد کے نام

گھر سے گھر تک

(آغازِ کتاب)

آج کل کے بچے جگ سو پزل کا مشغلہ بڑی دلچسپی، انہماک، جوش و خروش اور خوش اوقاتی سے اپناتے ہیں۔ اُن کے سامنے کسی تصویر کا ماسٹر پلان موجود ہوتا ہے۔ پھر اس منظر کو دیکھ دیکھ کر وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو اس سلیقے سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ ہو بہو عین ٹکڑیوں کا منظر ماسٹر پلان کا منظر بن جاتا ہے اور وہ اس طرح کی کامیابی پر اپنے آپ کو پرابلم حل کرنے والی کسی بڑی شخصیت جیسا اہم محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لیکن جب بھی کوئی سوانح نگار بائیوگرافی لکھتا ہے یا کسی شخص کی زندگی کی جگ سو پزل تیار کرتا ہے تو اُسے بہت سی کڑیاں غائب ملتی ہیں۔ پورا ڈیٹا نہ ہونے کے باعث نہ کوئی تیار شدہ ماسٹر پلان ہوتا ہے نہ کوئی روڈ میپ ہی، جس پر چل کر ہم اُس کی بلا دنگاری کر سکیں۔ تاریخ اور سوانح نگاری کے لیے عموماً ڈائریاں تلاش کی جاتی ہیں۔

لوگوں کے انٹرویو، صاحب ذکر کی کتابیں، موصوف کے خاندان کے لوگوں سے ''سی آئی اے'' قسم کی چھان بین، ملازموں کی جانچ پڑتال کام آتی ہیں، لیکن بائیوگرافی پھر بھی نامکمل، حواشی کی محتاج اور صورت گری کے دھندلے پن میں منتج ہوتی ہے۔ پورا انسان اپنی قلبی، روحانی، نفسیاتی، ذہنی زندگی کو اپنے ساتھ ہی لے کر رخصت ہو جاتا ہے.... اُس کی پہیلی کا راز اب صرف روزِ قیامت ہی کھل سکتا ہے۔

میں نے بھی ایک معمولی سی کوشش خاں صاحب کو آپ سے روشناس کرانے کی خاطر کی ہے۔

ساتھ رہتے ہوئے بھی خاں صاحب ہر انسان کی طرح میرے لیے مانوس اجنبی تھے۔ میں انہیں کالج میں ملی۔ پھر ہم نے گھر بسایا۔ کرائے کے مکان بدلے اور آخری مرحلے میں اپنا گھر 121- سی، ماڈل ٹاؤن میں بنا لیا۔ جہاں سے وہ اپنے اصلی گھر کو روانہ ہو گئے۔ یہ گھر اُن کی رخصتی کے بعد گھر نہ رہا، شہرت مابعد کا خزینہ بن گیا۔

میں بھی اپنے طور پر اُن کی مہربانیوں، شفقت اور شاگردی کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن میں تحقیقی متجسس مین میخ نکالنے والی نہیں ہوں۔ میں عموماً سنی سنائی پر ایمان لے آتی ہوں۔ میں سرہنگ زادوں کی طرح حکم مان کر اُٹھ نکلتی ہوں،

لیکن کسی جہادی کی طرح ایمان کی قوت میرے ہمراہ نہیں ہوتی بلکہ صرف کر گزرنے کا جذبہ ساتھ رہتا ہے۔ ایسی مہم پر ماسٹر پلان کے بغیر نکلنا عموماً فیروزمندی کا موجب نہیں ہوتا۔

پھر بھی "ہر کسے را بہ ہمت اوست" کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے قلم اُٹھا لیا ہے۔ منظر کشی کے لیے میرے پاس خاں صاحب تک ترسیل کے کئی ذرائع تھے۔

ایک ذریعہ گھر تھا جہاں ہم دونوں نے بسیرا کیا۔ اسے خاں صاحب نے ہمیشہ کبوتر کی کابک سمجھا کہ اُڑتے اور ہر اُڑان کے بعد اپنی اپنی کابک ہی رس آتی۔ دوسرے میرے پاس حسن اتفاق سے وہ یادداشتیں جو ساتھ رہنے کے باعث میسر آئیں، موجود ہیں۔

اُن کے اندر کے موسم کے ساتھ ساتھ بیرونی اطلاعات بھی تھیں۔ شہروں کی نقشہ نویسی، اپنی نقل و حرکت، کام کی وابستگی، ذمہ داری کی تفصیلات بھی میسر آتی رہتی تھیں۔ میں نے پورا سال یہ سوچنے میں بسر کیا کہ یہ مجھے خاں صاحب کو بے نقاب کرنے کا حق ہے؟ کیا خاں صاحب اس بے تکلفی اور نقاب کشائی پر برافروختہ نہ ہوں گے؟ کیا ان کو آپ کے سپرد کرنے کی اس وجہ خودستائی تو نہیں؟ کیا میں اس غلطی کی مرتکب تو نہیں کہ یہ قدم میں نے اپنی شخصیت کا تاج محل بنانے کی خاطر اٹھایا ہے؟

سال بھر سوچنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ آپ کے ساتھ اپنے ہم سفر کو کسی باغ کی ایک بینچ پر بیٹھ کر یاد کروں۔ اُوپر سے خزاں دیدہ پتے درخت سے گریں، ہوا میں نومبر کے مہینے کی خنکی ہو..... دُوران میں میرے بچوں کا بچپن آپ کو نظر آئے، آخری فوارے کے کنارے بیٹھے آپ کو خاں صاحب کے دوستوں کا جھرمٹ دکھائی دے..... ہولے ہولے شام کی سرخی غائب ہو جائے، پرندے گھروں کو لوٹ جائیں اور اندھیرے میں کسی گوشے سے خاں صاحب آگے بڑھیں اور مجھے میری غلطیوں سمیت اپنے گھر اپنی کابک میں واپس لے جائیں۔

یہاں ایک اندیشہ اور بھی اُبھرتا ہے جو مجھے ان یادداشتوں کو پبلک کی پراپرٹی بنانے سے روکتا رہا۔ وہ کھٹکا یہ ہے کہ لوگ عموماً تین نکالنے والے ہوا کرتے ہیں۔ کسی کی نیت سے ناآشنا ہونے کے باعث وہ کچھ سے کچھ اور ہی مطالب اخذ کر لیتے ہیں۔ ان کی وابستگی چونکہ معروضی اور مزاحمتی ہوا کرتی ہے، بسا اوقات وہ ایسے ایسے کیڑے نکال کر ہتھیلی پر دھر دیتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

بدیر سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک طور سے تو یہ اور بڑی نقاب کشائی کا عمل ہوگا۔ میں عرفانِ ذات کے مرحلوں سے نہیں گزری اسی لیے مجھ پر اپنی اور خاں صاحب کی اندرونی جبلت، فطرت، طبیعت، کردار کے اصل بھید نہیں کھلے۔ خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی ستون کے ساتھ سر لگا کر آنکھیں موند آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ اور صرف اپنے متعلق سوچو..... اپنے ارادے، خواہشات، دوسروں کے ساتھ تعلقات کے الجھے دھاگے، عمل اور علم کی دُوری، ماضی کے پچھتاوے، مستقبل سے وابستہ اُمیدیں، ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور ان سے بگٹٹ بھاگ کر آزادی پا لینے کی حسرت، کردہ اور ناکردہ گناہوں کی ورق گردانی، اندر کے موسموں کی چھان بین..... غرض

جیسے جیسے ہولے ہولے پرت در پرت' حقیقت اور خواب کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا جائے گا اور تمہیں اصلی شخص سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا جو تمہارے اندر جمناسٹک کرتا رہتا ہے۔

میں سمادھی نہ لگا سکتی ہوں نہ عرفانِ ذات کے جھنجھٹ میں پڑ سکتی ہوں کیونکہ عرفانِ ذات کے لمبے دباؤ سے گزر کر اپنے حواشی کو جاننا ایک لمبا پُرخطر راستہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی سمت معلوم کرنے کے لیے کسی اجنبی شہر میں کسی نامانوس شخص سے رابطہ قائم کر لینا آسان ہے بہ نسبت لندن میں نقشہ نکال کر کسی سڑک پر اپنے دوست کا گھر معلوم کرنے کا شغل۔

میں نے ہر پڑھنے والے کے سامنے خاں صاحب سے وابستہ کچھ یادیں رکھ دی ہیں۔ اب آپ لوگ ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میری لن ترانیوں کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ہم کس قدر گنجے فرشتے تھے اور کس حد تک سفید چادروں میں نظریں جھکائے خوشامدی' شیخی خورے' متکبر' خودغرض' کسی شیطانی ٹولے کے رفیق تھے۔

ہر انسان اول و آخر خاکی مٹی سے بنا ہے اور لوٹ کر پھر مٹی ہی کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں بشریت کے جملہ خصائص نہیں ہیں تو حتمی طور پر یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ میں بھی ان لوگوں کی احسان مند رہوں گی جو اس کتاب سے معروضی انداز سے نتیجے نکالیں گے۔ اگر ان کی آواز مجھ تک جیتے جی پہنچ گئی تو میں ان کی شکرگزار رہوں گی۔ اگر میرے بعد ان کی رائے دوسروں تک پہنچ پائی تو بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیونکہ وہ بت شکنی کر کے بت پرستی کے شغل سے بچ سکیں گے اور خاں صاحب جن کے چاہنے والے ان گنت ہیں اپنی رائے میں تھوڑے سے محتاط ضرور ہو جائیں گے۔

ایک سب سے بڑی وجہ آپ تک یہ مواد پہنچانے کی یہ بھی ہے کہ آج کے نوجوان آزادی کے مفہوم کو نہ سمجھتے ہوئے آزادی کے درپے ہیں۔ جب بھی آزادی ملتی ہے اسی تناسب سے آزادی دینا بھی پڑتی ہے۔ اگر حقوق کے پیچھے پڑ جائیں تو حقوق ادا کر کے ہی جان چھوٹتی ہے۔ لکھنے کی آزادی ہم دونوں نے بغیر کسی سے اجازت لیے ہتھیائی تھی۔ اس کتاب سے اب ہم دونوں Commitment کے بند دائرے میں اُتر گئے ہیں۔ مسلسل اتنے سال اشارے کنائے' اعتراف و ارتکاب کی فضا میں رہتے ہوئے ہم نے خود فراری راہیں' فیصلے کی آزادی اور ایک دوسرے سے عذر خواہی کا حق چھین لیا تھا۔

ہمارے بابا جی نور والے کہا کرتے تھے کہ جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات تو عمر کے آخری حصے میں سمجھ میں آئی لیکن اس وقت خاں صاحب کو خط لکھ کر خط پا کر کچھ ایسا سرور ملتا تھا کہ اس شغل سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ محبت کا دماغ میں وہیں وقوف ہے جہاں عادت' نشہ' کساہٹ اور لذت کا مقام ہے۔ سگریٹ' ہیروئن' چرس' بھنگ' افیون یہ سارے شوق ھل من مزید کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کچھ ایسی کیفیت محبت کی بھی ہے..... یہ آخری بار مل لوں..... آخری بار دیکھ لوں..... بس یہی آخری لمس ہوگا۔ غالباً جنس اور محبت دو علیحدہ دماغی حصوں میں بسرام کرتے ہیں۔ محبت تسلسل کی آرزومند ہے جبکہ Sex اُبال کی شکل میں گھیرا ڈالتی ہے..... محبت کا متلاشی کبھی کبھی جان سے گزر جانے کو بھی کھیل سمجھتا ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب محبت میں اعتراف کی گانٹھ دونوں رسیوں میں مضبوط ہو جاتی ہے.....

اب اس محبت کو دائمی بنانے کی اُلجھن شادی کا کہا اور اَن کہا وعدہ بن جاتی ہے..... روزِ ازل سے مرد اور عورت جب کبھی محبت کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں' اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سفر جو اُنہیں ایک دوسرے سے commit کر رہا ہے' لمبا

بھی ہے اور پُر خطر بھی۔ اس میں وعدے کا پاس بسا اوقات گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔ جس طرح کبھی کبھی منشیات بڑی قیمت وصول کرتی ہیں' ایسے ہی محبت اور شادی پر منتج ہونے والی محبت ایک بہت بڑا چیلنج بن کر زندگی میں داخل ہوتی ہے.....

جس درجے کی توفیق نہ ہو اُس کا اعلان کر چکنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ روزمرہ کی زندگی میں نشہ آور سرور کہاں گم ہو گیا؟ وہ ربطِ باہمی کس مقام پر کیوں اور کیسے Clash میں بدل گیا..... انسان چونکہ فطرتاً آزاد ہے۔ اس شادی کے بندھن میں جو سب سے بڑا چیلنج اُسے پیش آتا ہے' وہ یہی Free Will کی آزادی ہے۔

شادی کے بعد اپنا ارادہ' ذات اور فیصلے سبھی کی خاطر ارپن کر کے مسرت محسوس کرنا ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ بھی کسی شخص کو اُس وقت تک ہدایت نہیں دیتا جب تک انسان اپنی خوشی یا فیصلے سے اللہ سے ہدایت طلب نہ کرے۔ شادی میں بھی مکمل سرور اسی وقت ملتا ہے جب اپنے فیصلے سے اپنی قوتِ ارادی کو ساتھی کی خواہش پر قربان کرنے کا شوق' ولولہ اور جوش نہ ہو۔ اس سلسلے میں آج کل کے نوجوانوں کے لیے یہ کتاب رہنمائی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

جس قدر بڑی Commitment ہو اگر اعلان بھی اتنا ہی بلند بانگ ہو جائے گا تو اسی تناسب سے اپنی Free Will بھی چھوڑنا ہو گی۔ پھر رشتہ محمود و ایاز کا بن جائے گا' عاشق و معشوق کا نہ رہے گا۔ پھر نمرود کی آگ میں کود بھی جائیں تو آگ جلا نہ سکے گی' لیکن عام طور پر محبت اور نشے کی اوّلین حالت میں انسان ندامت داری کو سمجھتا ہے نہ دور اندیشی ہی سے اُس کا تعلق ہوتا ہے۔

اسی لیے محبت کی شادیاں عموماً Disillusionment پر ختم ہوتی ہیں اور ساتھی توقعات لگانے کے بعد اپنا اپنا خیمہ اُکھاڑ کر یا تو طلاق کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں یا پھر Extra-marital تعلقات میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ تعلقات خلع یا طلاق کسی طور بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتے کہ غلطی تو انسان کی اپنی شخصیت' اُس کے اپنے مرکز میں ہوتی ہے۔ وہ کسی صورت بھی اپنا ارادہ' فیصلہ' تجویز چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا.....

دوئی ہوتے ہوئے یکجائی پر اصرار کیوں؟ یہ کتاب اس اُمید پر چھاپ رہی ہوں کہ آج کل کے تیز رفتار' جلد اُکتا جانے والے ہر وقت تبدیلی کے آرزومند سوچ سمجھ کر اس دریا میں قدم ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہیں کہیں پانی گہرا ہو اور آپ کو تیرنا بھی نہ آتا ہو۔

میری شادی ہمارے دونوں گھر والوں کے لیے ایک لاینحل مسئلہ تھا۔ خاں صاحب کے خاندان والے روایات کے پابند' سکندری طبیعتوں کے مالک' خود اعتماد لوگ تھے۔ اُن کے خاندان میں کبھی کسی نے روایات توڑ کر باہر کی کسی لڑکی سے شادی کا سوچا بھی نہ تھا۔

جب خاں صاحب کی آوی جاوی کالج کے بعد 24- کینال پارک تک بڑھی تو گھر والے بے طور متوحش ہوئے۔ اُن کے گھر میں ریڈ الرٹ جاری ہو گیا۔ گھر والے منہ سے تو کم بولے لیکن تیل اور تیل کی دھار دیکھتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُونٹ چاہے کسی کروٹ بیٹھے اُن کی روایات کو پامال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اِدھر جب میری والدہ نے اپنی معاملہ فہمی سے معاملے کا پتا لگایا تو ایک روز وہ چرخہ خرید لائیں۔ اسے

...ے میں لگایا۔ ساتھ روئی کی پونیاں ایک ٹوکری میں رکھیں اور کہنے لگی '' کاکی..... میں بی اے بی ٹی ہوں..... انسپکٹرس آف سکولز ہوں' لیکن میں سمجھتی ہوں مسائل کے سوچنے اُن کی کتر بیونت کے لیے چرخے سے اچھا کوئی مشغلہ نہیں۔ اتنی ...بات لو کہ تمہارے کھیس تیار ہو جائیں اور تم اپنے شوہر کو دکھا سکو کہ تم سلیقہ شعار بھی ہو اور پڑھی لکھی بھی.....''

پھر میری امی نے مجھے چرخے کی ہتھی پکڑا پونی اُٹھا کر دھاگے کو نہ ٹوٹنے دینے کا فن' مال پر نظر رکھنے کے گُر ...ئے۔ میں جلد ہی چرخہ کاتنے کا ہنر سیکھ گئی۔ کروشیے پر تو عبور حاصل نہ کر سکی جس میں میری والدہ ماہر تھیں اور اپنے ہاتھ سے انہوں نے بہت سی جالیاں' ٹوپیاں' میز پوش بنا رکھے تھے' لیکن مجھے ٹیٹو کا شوق پیدا ہو گیا اور میں گرہیں ڈالنے اور ان سے دوپٹے کی لیس بنانے میں ماہر ہو گئی۔ مجھے سلیقہ شعار بنانے کے دوران ایک روز انہوں نے کہا..... '' میرے پاس اس وقت دو رشتے ہیں۔ جس کا سرکاری نیت ورک نیا نیا کھلا ہے وہ اس کا کرتا دھرتا ہے..... دوسرے ایک کرنل صاحب ہیں۔ یہ رشتہ تمہاری سہیلی محمودہ منظور نے کی ہے۔ فیصلہ کر لو۔ زبانی نہ بتا سکو تو محمودہ کے ذریعے بتا دینا.....''

میں نے جرأت کر کے کہا..... '' مجھے اگر شادی کرنا ہے تو اپنی مرضی کی کرنا ہوں۔ اگر بوجوہ وہاں میری شادی نہ ہو سکی تو میں ساری عمر نوکری کروں گی..... لاہور کالج فار ویمن میں اردو کی لیکچرار بن جاؤں گی۔ ٹیمبر ڈ میں پڑھا لوں گی۔'' انہوں نے میری مرضی نہ پوچھی اور رسان سے بولیں '' دیکھو کاکی! جب بھی آدمی اپنی مرضی کرتا ہے اُسے کچھ قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے..... اچھی طرح کاتتے وقت سوچ لو..... بھاری قیمت ادا کر لو گی؟''

تو قارئین! یہ کتاب وہ خام مواد ہے جس کو کوئی تقہ مشاق' گہرائی سے موتی نکالنے والا تحقیق نگار جناب اشفاق احمد پر ایک جامع کتاب لکھتے وقت کچھ کچھ استعمال کر سکتا ہے۔

کبھی کبھی وقت کی گرد خود شخصیت کی تصویر پر اس طرح پڑ جاتی ہے کہ اُس پر نہ تو کسی کو مزید کام کرنے کی سوجھتی ہے نہ نئی پود کو اپنے مشاہیر ہی کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بہر کیف میں نے یہ ساری یادداشتیں بہت سینت سینت کر سنبھال رکھی ہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ یادوں میں قلبی' ذہنی' نفسیاتی کیفیات بڑی واضح ہو جاتی ہیں۔ انسان قلم اور کاغذ سے آگے اظہار کی ایک اور سرحد چھونے لگتا ہے جو گفتگو میں فروعی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔

انسان نے اظہار کے لیے ہمیشہ خطوط' پھول' مٹھائی' کپڑے' زیورات استعمال کیے ہیں۔ مشرق میں گجرے' موتیے' چنبیلی کے گتھے ہوئے اور گوٹے کناری سے سجے زیباتشی ہار ہم سب کی یادوں میں پنہاں ہیں۔ مغرب کے لوگ گلدستے دینے کے عادی بن گئے ہیں۔ کارڈ بھیجنے اور اس پر خوبصورت عبارتیں لکھنے کے شوقین ہیں۔ اب تو ہم لوگ بھی گلدستے اور کارڈ بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں' لیکن ارتکازِ زر اور دولت کے شیدائی ہونے سے پہلے مشرق میں اپنا آپ ارپن کرنے کا رواج تھا۔ جس قدر تعلق خاطر ہوتا اُسی تناسب سے اپنا وجود ہاتھ جوڑ کر پیش کر دیا جاتا اور آرتی اُتارنے کے لیے یاد سے بہتر کوئی تھالی نہ تھی۔

عجیب سی بات ہے کہ سارے بہن بھائیوں کی لکھائی اور گفتگو ایک سی ہے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ خاں صاحب کے والد ڈاکٹر بابا محمد کے آٹھوں بچے ایک ہی طرح سوچتے تھے۔ ایک سا تڑپتے اور ایک سے الجھاؤ کا شکار تھے۔ ویسے تو زندگی گزارنے کا کوئی حتمی نسخہ ابھی ایجاد نہیں ہوا' لیکن ہر فرد اپنی Genetics اور ماحولیات سے جو کچھ

اخذ کرتا ہے وہی اُس کا خام مواد ہے۔

پھر اس مواد سے وہ کوزہ بنائے یا لوٹا' صراحی' طبلے یا سوہنی کا کچا گھڑا۔ بہر کیف اُسے راستہ خود ہی بنانا پڑتا ہے۔ ان بہن بھائیوں نے بھی اپنے اپنے جینے کا ڈھنگ علیحدہ علیحدہ بنایا لیکن اس علیحدگی کے باوجود ان میں ایک مشابہت ہے جو نئے ملاقاتی کو بہت متاثر کرتی ہے..... یہ جادوگر قسم کے لوگ ہیں جو نظر بندی کا فن جانتے ہیں' لیکن کسی کو اندر کے انتشار کی خبر نہیں ہونے دیتے.....

ان یادوں سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ان کے اندر متضاد جذبات کی جنگ ہمیشہ جاری رہی۔ ان ہی جذبات کے باعث خاں صاحب کشمکش' اداسی' منزل پر پہنچ کر بھی منزل سے مایوسی کا چسکا پالتے رہے۔ انہیں منیر نیازی کی طرح کوئی موسم' کوئی جگہ' کوئی شہر مکمل طور پر راس نہیں آیا۔ یہ موسم جناب اشفاق احمد پر تو اُس وقت تک طاری رہا جب تک وہ جناب حنیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری کی وساطت سے بابا جی فضل شاہ نور والے کے پاس نہ پہنچے۔

اپنے کسی خط میں انہوں نے اپنے والد بابا محمد خاں کو تحریر کیا ہوگا کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ یہ خط چونکہ بابا جی کو لکھا گیا مجھے معلوم نہیں انہوں نے اسے محفوظ رکھا یا تلف کر دیا لیکن اشفاق صاحب نے ایک بار مجھے اس خط کا متن بتایا تھا۔ بابا جی کا خط اُس باپ کی رائیگاں کوششوں کا بیانیہ ہے جس نے ہر طرح سے بچوں میں خود اعتمادی' زندگی سے دست پنجہ کرنے کی صلاحیت اور تعلیم کو ہتھیار بنا کر استعمال کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیا تھا' لیکن کیا کیا جائے یہی تو زندگی ہے۔ سائنس اصول بناتی ہے اور اُس پر کاربند رہتی ہے' لیکن زندگی کوئی اصول نہ گھڑتی ہے نہ تجویز کرتی ہے..... کسی نتیجہ پر قابض نہیں۔ یہاں مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ زندگی بہر حال اصول کے ساتھ نہیں' اُوپر والے اصول ساز کے ساتھ چلتی ہے۔

خاں صاحب کی Genetics کو سمجھنے کے لیے اُن کی فیملی بیک گراؤنڈ کو سمجھنا مفید رہے گا۔ میں جو کچھ سنی سنائی جانتی ہوں وہی گوش گزار کر سکتی ہوں۔ لمبے ساتھ کی وجہ سے بہت کچھ جان گئی ہوں' لیکن مجھے بخوبی علم ہے کہ ہر انسان سربستہ راز ہے حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے وجود سے کلی طور پر آگاہ نہیں ہوتا۔ صرف عرفانِ ذات کے ماہر صوفی واقعی بڑی سہولت سے اپنے آپ کو جان کر اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں' لیکن یہ کسی نصیب والے کو آگاہی ملتی ہے کہ عرفانِ ذات ہی عرفانِ حق ہے۔

دراصل میں جب گورنمنٹ کالج میں تھی تو میں 1- مزنگ روڈ سے واقف نہ تھی' لیکن جب ہماری رہائش 24- ایس کینال پارک میں ہوئی اور خاں صاحب میرے بڑے بھائی پرویز سے سرورق بنوانے کے سلسلے میں آنے جانے لگے تو 1- مزنگ روڈ میری زندگی میں کسی انجانی سلطنت کے دارالحکومت کی سی کشش اختیار کر گیا۔

بہار کا موسم ہو یا خزاں کی رُت' کچھ پودے اور درخت اپنے اپنے مقررہ وقت پر پتے ہوا کے دوش پر اُچھالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح درختوں' پھولوں سے بھی پولن جھڑ کر ہوا میں اُڑا کرتا ہے۔ سنبل کے پھوئے' روئی کا پولن' چیڑ کے درخت سے جھڑنے والے جنگلی چلغوزے..... اور اسی طرح کینچلی اُتار پھینکنے والے سانپ' جھبرے بالوں والے

جانوروں کے بال، مرغابیاں اور کچھ مختلف قسم کی بطخیں اور migrate کرنے والے پرندوں کی سرشت میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہجرت آتی ہے۔ وہ ڈاروں کی شکل میں پڑاؤ ڈالتے، ستاتے، نئے چشموں، سرد ہواؤں سے بچتے غیر شعوری طور پہنچتے نوں، باغوں اور ریتیلے ساحلوں (Beaches) پر اُترتے ہیں۔

ایک مدت انسان صحرا نورد خانہ بدوش گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا رہا ہے۔ پہلے یہ ہجرت کا سلسلہ گروہ کی شکل میں ہوا کرتا تھا اور جب ڈنڈا ڈولی کر کے خانہ بدوش ساتھ ساتھ چلتے تو خوف، خوشی اور Excitement میں اُس کا موڈ بن جاتا...... ہجرت کی روایت بہت پرانی اور انسان کے لہو میں ارتعاش اور تبدیلی پیدا کرنے والی رہی ہے.....

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہجرت کرنے والا عموماً اکیلا وطن چھوڑتا ہے۔ پردیس کی صعوبتیں سہتا، نئے ماحول اور موسم کے تھپیڑے کھاتا ہے۔ عموماً تحریک تلاشِ معاش ہوتی۔ اب نگری نگری گھومنے والے کو بنیادی طور پر فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ گروہی ہجرت یا Migration میں فیصلہ عموماً پورا قبیلہ یا گروہ کے سربراہ کیا کرتے تھے لیکن اب ہجرت ایک فرد کا نصیب ہے۔

خاں صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اُس تناؤ کو زیرِ غور رکھنا بے حد ضروری ہے جو ہر اقلیت کو درپیش رہتا ہے۔ ہر اقلیت جب ہجرت کر کے کسی نئے دیس میں بسرام کرتی ہے تو وہ اپنے رسم و رواج، بولی، اندازِ زیست و اقدار ساتھ لاتی ہے۔ نئے ماحول میں اُسے عجیب قسم کی Insecurity کا سامنا رہتا ہے۔ وہ خوف اور احساسِ کمتری کا اس لیے شکار ہوتی ہے کہ کہیں اکثریت میں اُس کی شناخت گم نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ لاشعوری طور پر اُسے ہموار اور متوازن زندگی کے لیے وہ سہولیات، مراعات اور رعائتیں بھی درکار ہوتی ہیں، جو کسی اکثریت کو اس طرح پیدائشی طور پر ملتی ہیں، جس طرح دریا میں بسنے والی مچھلی کو پانی۔ اکثریت کو کبھی اپنی خوش نصیبی کا شعوری احساس پیدا نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد کے بڑے بچوں نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان چھوڑ کر ترائی کی جانب پنجاب کی طرف جا بسیں۔ خدا جانے مہمند قبیلہ جتھوں کی شکل میں عازمِ سفر ہوا کہ چھوٹے چھوٹے خاندان اپنا اثاثہ باربردار جانوروں پر لادے مشکل راستوں سے ہو کر مختلف جغرافیائی حدود میں ہونٹ سکیڑے کچھ اُداس، کچھ پُرامید، کچھ ہراساں چلتے چلتے پنجاب میں آ بسے۔ ہوشیار پور کے مقام پر انہوں نے جوتوں کے تسمے کھول دیئے اور اپنی کاشتکاری کی روایت کو قائم رکھا۔

مہمند قبیلہ موروثی طور پر کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک تھا، لیکن چونکہ یہاں زمین دستیاب نہ تھی، محمد مستقیم خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مقامی باراتوں کے ساتھ حفاظتی جتھہ بنا کر چلا کرتے۔ رفتہ رفتہ وہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ اسلحہ سجا کر حفاظتی گروہ بنا کر سفر کرنے لگے۔ دو تین پیڑھیوں کے بعد اسی خاندان میں محمد معظم خاں نے جنم لیا، جو اشفاق صاحب کے دادا کے والد تھے۔

جناب اشفاق احمد مہمند پٹھان تھے۔ وہ اپنی اس شناخت کو چھپاتے تھے۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ خاں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا دیس ہوگا۔ وہاں نہ نسبی نہ علاقائی زبانوں کا تفاخر ہوگا۔ یہ دھرتی مہاجر اور انصار کی سانجھی ہوگی اور انصاف کے تحت چلنے والا نظام رائج ہوگا۔ اسی خواب میں گم انہوں نے 39 برس تلقین شاہ لکھا، لیکن اصل تضاد یہی تھا کہ انہیں اپنے مہمند قبیلے سے بھی عشق تھا۔ وہ اپنی روایات سے بھی محبت

کرتے تھے۔ساتھ ساتھ وہ ذات برادری سے باہر شادی کر کے ان روایات کو توڑنا بھی نہ چاہتے تھے۔

ان کے پُرکھ جب ہجرت کر کے پنجاب میں پہنچے تو تمام اقلیتوں کی طرح انہوں نے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے مٹھی بند معاشرہ قائم کیا۔ یہ لوگ نہ مداخلت کرتے تھے نہ مداخلت برداشت کرتے تھے۔ انتہا کے مہمان نواز لیکن دوستی کو دسترخوان سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔میل جول میں اس درجہ محتاط کہ ذات برادری سے باہر شادی کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔یہی تضاد اندر ہی اندر خاں صاحب کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔

جب انہوں نے مجھ سے شادی کا ارادہ کیا تو یہی تضاد آری کی طرح ان کے اندر چلنے لگا۔اسی سے فرار حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کئی راستے اختیار کیے۔ کبھی مری، کبھی جہلم، کبھی کراچی اور آخر میں اگلی ٹھکانا بنا کر ایک اور ہجرت کر لی۔

خاں صاحب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ خاں صاحب کے دادا دوست محمد خاں خاندان کی آبرو اور پہلے قابلِ ذکر آدمی تھے۔ بے انتہا خوبصورت، ذہین اور دُھن کے پکے تھے۔ بدقسمتی سے ان کی شادی ایک کریہہ صورت سانولی بدہیئت پٹھان لڑکی سے کردی گئی۔ نہ انہیں شادی سے پہلے دلہن دکھائی گئی نہ کسی نے آمادگی ہی پوچھی۔ دوست محمد خاں صاحب کے دادا جمال پرست تھے۔ بیوی کو دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔ یہ پٹھان بچہ حسن میں بے مثال، وجاہت میں لاثانی تھا۔

ویسے تو شکل وصورت اُوپر والے کی دین ہے۔انسان اپنے آپ کو اس سلسلے میں تبدیل کرنے سے قاصر ہے لیکن کیا کیا جائے سفید قومیں سیاہ اور براؤن جلد کو بھی معاف نہیں کرتیں اور عموماً اس درجہ خود پرست ہوتی ہیں کہ وہ سیاہ شکل وصورت والے فرد کو مکمل طور پر ہی رد کر دیتی ہیں۔ یہی مسئلہ دوست محمد خاں کو درپیش ہوا۔ بیوی کا گھونگھٹ اُٹھاتے ہی انہیں ابکائی آ گئی۔ بیوی گو پٹھانی تھی لیکن سانولی بھی تھی اور بدشکل بھی۔ اُدھر دوست محمد خاں کا حسن گریک مجسمے کا سا تھا۔

دوست محمد خاں نے دل میں ہجرت کی ٹھانی۔ چپ چاپ حیدرآباد کا قصد کیا لیکن روحیں تو اُوپر والے کے علم سے رحم میں اترتی ہیں۔ بابا جی محمد خاں کو اس دنیا میں دوست محمد خاں جیسا پڑھا لکھا خوبصورت باپ ملنا تھا سو وہ اپنی بدصورت ماں کی گود میں پروان چڑھنے لگا۔ دوست محمد خاں کے بیٹے اور خاں صاحب کے والد اپنی ماں سے مشابہ تھے۔ بابا جی محمد خاں کا قد چھوٹا، رنگ گہرا سانولا، چہرے پر چیچک کے داغ، ناک نقشہ بھدا تھا۔ وہ اپنے نستعلیق باپ دوست محمد خاں سے ہر طور مختلف تھے۔

بابا جی دوست محمد خاں کی پذیرائی حیدرآباد دکن میں سرخ قالین پر ہوئی۔ وہ دربار میں اپنی فضیلت، فارسی دانی اور علم دوستی کے باعث جلد اتالیق کے عہدے پر پہنچ گئے اور نواب زادوں کی تربیت خوب نبھانے لگے۔ گو اُن کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ نہ تھا لیکن دوست محمد خاں باقاعدگی سے اپنی بیوی اور بچے کی کفالت کرتے تھے اور بیٹا گورنمنٹ کالج سے ملحق Montmorancy College میں جسے عوام ڈنگر ہسپتال کہتے تھے، تعلیم پانے لگے۔ بابا جی محمد خاں شکل وصورت میں والدہ کی طرح تھے اور ذہانت، علم دوستی اور استقامت میں اپنے علم دوست باپ پر گئے تھے۔

میں یہ باتیں آپ کو کسی طور پر کسی دعویٰ کے ساتھ پیش نہیں کر رہی۔ یہ ساری سنی سنائی، منہ در منہ کی کہانیاں ہیں۔ سارے بہن بھائی ایک ہی کہانی مختلف انداز، لب ولہجہ اور بناوٹ میں سناتے تھے لیکن ہر ایک کے لہجے میں وہی تفاخر،

ممتازگی ہے۔ اس سارے خاندان کو اپنے دادا دوست محمد خاں کے حسن پر ناز اور اپنے پیرزادے ہونے پر فخر ہے۔

پردیس بسنے والے والد کی ساری توجہ کا نتیجہ تھا کہ خاں صاحب کے والد محمد خاں پڑھتے چلے گئے اور Montmorancy College سے ڈنگر ڈاکٹر بن کر نکلے۔ اب انہیں اپنی کلا جگانے کے لیے دو چیزیں درکار تھیں۔ ایک تو اپنی بدصورتی چھپانے کے لیے خوبصورت بیوی' دوسرے اپنے پروفیشن میں نام پیدا کرنے کے لیے مناسب حالات۔ باباجی محمد خاں نے خاں صاحب کی والدہ بی بی سردار بیگم سے شادی کی جو اس درجہ خوبصورت تھیں کہ ابھی تک ان کے سارے خاندان میں ان کے مدمقابل کوئی صورت نہیں آسکی۔

قدرت ہر انسان کو اُس کے عمل کی کچھ جزا یا سزا تو یہیں عطا کر دیتی ہے' کچھ حساب کتاب کے لیے اس نے قیامت کی شرط لگا رکھی ہے۔ جس طرح آواگان کا فلسفہ بہتر عمل کی طرف راغب کرنے کا ایک نسخہ ہے۔ ایسے ہی قیامت کا اندیشہ بھی انسان کو نیک عمل کرنے پر اکساتا ہے اور اللہ کو قرض حسنہ دے کر اپنا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں لے کر اٹھنے کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں جڑ پکڑے رکھتی ہے۔

باپ کے رویے کی وجہ سے ڈاکٹر محمد خاں میں بھی ایک گہرے تضاد نے ہولے ہولے جڑیں پکڑ لیں۔ انہوں نے کبوتر پالنے اور پتنگ بازی کا مشغلہ جو انہیں دل سے پسند تھا' چھوڑ دیا۔ ذمہ داری کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا' لیکن جس باپ کے احسان تلے وہ دبے رہے تھے اس کے شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی عدم موجودگی کے باعث وہ اُسی سے شدید نفرت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ زندگی میں باپ سے بڑھ کر کچھ کر دکھائیں گے۔ ایک طرف تو وہ شادی کے بندھن سے نفرت کرتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔

کسی وقت' کسی مقام اور لمحے نے فیصلہ کیا اور باباجی نے منفی جذبات کو نیام میں بند کیا اور فیسرین کے موجد بن گئے۔ علاقے میں ایسے مشہور ڈنگر ڈاکٹر ہوئے جو گھوڑے کو ٹیکہ لگا کر اکیلا ہی ڈھا سکتا تھا۔ بڑے بڑے سکھ سردار اُن کے مرید ہو گئے۔ اُن کی خوبصورت بی بی سردار بیگم اُن کی کارکردگی کے باعث اُن کی مطیع ہو گئیں۔ ہولے ہولے انہوں نے جانور چھوڑ انسانوں کا علاج شروع کر دیا۔ شفا شامل حال رہی اور ان کے مریض دور دور سے آنے لگے۔

باباجی محمد خاں بھی ایک بڑی تنومند شخصیت تھے۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اپنی دور رس دانش سے اُس سے پیدا ہونے والے اثرات کے نتائج اخذ کر لیتے۔ تجویز اُن کی بیساکھی' لاٹھی' چوب' ہنا و بچاؤ تھی۔ شاید ڈاکٹر محمد خاں کو علم نہ تھا کہ یوں تو انسان کا علم قلیل ہے۔ پھر اس کی تجویز پانی دینے پر مامور ہے' لیکن پھل پھول لانے پر قادر نہیں۔ انسان کو رزق حلال کمانے کا حکم ضرور ملا ہے' لیکن وہ کس قدر رزق کما سکے گا اس کا کسی شخص کو علم نہیں۔ باباجی محمد خاں بھی ہر محنتی' ترقی پسند' سب کی سیدھ چلنے والے آدمی کی طرح اپنی محنت کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ اُنہیں Genetics کی کھیل کا علم نہ تھا نہ ماحول میں چھپے ہوئے شکست دینے والے عناصر ہی کا کوئی بچاؤ تھا۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہ تھا کہ کئی بار بغیر ڈگریاں حاصل کیے انسان اللہ کی مہربانی سے فلسفی' شاعر' مجتہد' عالم بن کر وقت پر اثر انداز ہو جاتا ہے' لیکن اُسے علم نہیں ہوتا کہ یہ طاقت غیب سے کیونکر آئی۔ کیا اس کی تحریک کوئی دعا تھی یا وہ دور آرزو' شوق اور خواہش تھی جو آسمان چیرتی اللہ کے حضور پہنچتی رہی۔

بہرکیف اپنا پیشہ چمکانے کی خاطر انہوں نے مکتسر مشرقی پنجاب کا قصباتی گاؤں چنا۔ یہاں سکھ سرداروں کی لہلہاتی زمینوں پر گھوڑے، بھینسیں، بکریاں، ٹوہر قسم کے جانور تھے۔ ڈنگر ڈاکٹر کی لحظہ بہ لحظہ احتیاج رہتی تھی۔ ہوتے ہواتے وہ خلقِ خدا کی نبضیں بھی دیکھنے لگے۔ عورتوں کے امراض پر بھی حاوی ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ایک حویلی نما گھر بھی بنالیا، جس میں باہر ایک باغ تھا جس کو باباجی پائیں باغ کہتے تھے۔ اب گھوڑوں کا اصطبل بھی وجود میں آ گیا۔ بھانت بھانت کے اعلیٰ نسلی گھوڑے بندھے نظر آنے لگے۔

باباجی کو گھڑسواری کا بے حد شوق تھا۔ اُن کا خیال تھا اعلیٰ نسل کی بیوی، اعلیٰ نسل کا کتا، اعلیٰ Pedigree کا گھوڑا، اعلیٰ نسل کے اشراف کی نشانی ہے۔ دراصل مرد کو ازل سے سواری کا شوق رہا ہے۔ آج کل کے زمانے میں گھوڑے نہیں چرائے جاتے، اب کاریں اس شوق کے زیرِ عتاب آ چکی ہیں۔ بڑی گاڑیاں Status سمبل بن چکی ہیں اور ان کے بغیر مرد اپنے آپ کو نامرد سمجھنے لگتا ہے۔ ہر بینک رہن پر گاڑی فروخت کر کے خلق کی گھڑسواری کا شوق exploit کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں نے اپنے آٹھ بچوں کو گھڑسواری سکھائی۔ آپا فرخندہ اور آپا فرحت تک یہ فن جانتی تھیں۔ حالانکہ مسلمان گھرانوں میں تب پردہ سخت تھا۔ آفتاب بھائی اور خاں صاحب پڑھنے لکھنے والی شخصیتیں تھیں۔ انہیں اس لہو و لعب کا کوئی شوق نہ تھا لیکن ان کو بھی بابا محمد خاں نے بددلی گھڑسواری سکھائی۔ مارے باندھے یہ بھی باپ کے شوق میں شامل ہوتے رہے، لیکن گھڑسوار نہ بن سکے نہ پولو جیسی کھیل ہی میں دلچسپی لے سکے۔ حالانکہ اسحٰق بھائی نے دیہاتی بچوں کی پولو ٹیم بنا رکھی تھی اور رات کو پولو کی گیند کو مٹی کا تیل لگا کر جلاتے اور دیہاتی لونڈوں کو پولو کھیلنا سکھاتے۔

دوسری تجویز باباجی نے علم کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگانے میں صرف کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پڑھ لکھ کر ہی انسان دوست محمد خاں بن سکتا ہے۔ باباجی محمد خاں اپنے تعلقات میں ہر بڑے آدمی کی طرح تضاد کا شکار رہتے تھے۔ جس والد سے احساسِ محرومی کے تحت انہوں نے نفرت پال رکھی تھی، وہی والد کہیں اُن کا رول ماڈل بھی بن گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بغیر تعلیم کے کوئی شخص نہ مکمل ہو سکتا ہے نہ اسے خاندان یا معاشرے میں کوئی مقام ہی حاصل ہونے کے امکانات تھے۔

اسی تجویز کے تحت انہوں نے گھر پر ٹیوشن سنٹر کھول لیا۔ صبح سویرے چار بجے ہسپتال جانے سے پہلے اپنے بیٹوں کو اُٹھانے کا حکم تھا۔ ماسٹر جی آ جاتے۔ وہی ماسٹر جی جو خاں صاحب کو ''گولو مولو'' کہتے تھے اور دسویں میں پہلی بار فیل ہو جانے کے بعد ان ہی داؤجی کے گھر جناب اشفاق احمد خاں صاحب کو منتقل کر دیا گیا اور یہیں سے اُس ''گڈریا'' کی شخصیت اخذ کی گئی جو بعد میں اُردو ادب کے کلاسیک کا حصہ بن گئی۔

مارے باندھے جمائیاں لیتے آفتاب بھائی، افتخار بھائی، اقبال بھائی، اسحٰق بھائی اور خاں صاحب اُٹھتے۔ رات کو گھر سے چوری چوری نکل کر اسحٰق بھائی کی ایجاد کردہ پولو کھیلنے سے ویسے ہی جسم چُور ہوتا لیکن باباجی کا خوف غالب رہتا اور مارے باندھے اٹھتے۔

زندگی کی کروٹوں کو لاکھ جوتش سے سمجھنے کی کوشش کریں، استخارے نکالیں، فال ڈال کر مستقبل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کریں۔ یہ اپنی کروٹیں اپنی مرضی سے لیتی ہے۔ حیدرآباد میں نواب صاحب کے بیٹے کا اتالیق اچانک بیمار ہو گیا۔ لاکھ درباری حکیم نے معجونیں، شربتیاں، عرق پلائے، لیکن افاقہ نہ ہوا۔ دوست محمد خاں پر فالج کا حملہ ہو گیا۔

بابا دوست محمد خاں نے اپنی بیوی کی بدصورتی کے ہاتھوں اپنے آپ کو فرار کے عمل سے دوچار کیا تھا لیکن اللہ تو توازن قائم کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ حیدرآباد میں جب بابا دوست محمد خاں پر اچانک فالج کا حملہ ہوا تو بابا جی محمد خاں جو بے پروا اپنے گھر کی چھت پر کبوتر اڑایا کرتے تھے اور لاابالی طبیعت کے مالک تھے، اچانک سنبھل گئے۔ ایک فالج کی آفت سے اللہ نے باپ بیٹا دونوں کے رخ موڑ دیئے۔ توازن کے پلڑے برابر کر دیئے گئے۔ بابا جی محمد خاں اپنی بے حد خوبصورت بیوی سردار بیگم کے پاس آئے اور بولے ''میرے والد حیدرآباد میں بیمار پڑے ہیں۔ میں انہیں گھر لانا چاہتا ہوں۔'' یہ عہد بیویوں سے ڈرنے کا نہیں تھا۔ مرد ابھی اپنی فضیلت کے نشے میں سرشار بیوی کو جوتی سمجھتے تھے۔

''لے آئیں جی .... جیسی آپ کی مرضی ....'' دراز قد اماں جی نے کہا۔

بابا جی نے جھنجھلا کر کہا ''اس بار میری مرضی نہیں تمہاری رضا چاہیے۔ بابا جی فالج کے مریض ہیں۔ ان کو نہلانا دھلانا، بول و براز کی گندگی کے کام ہوتے ہیں، کرلو گی؟ .... میں تو ہسپتال میں رہتا ہوں۔ زیادہ بوجھ تو تم پر ہی ہوگا۔''

''میں بچوں کی ماں ہوں .... میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ....''

اب ڈاکٹر محمد خاں مکتسر سے حیدرآباد پہنچے۔ مردہ صورت باپ کو لے کر گھر پہنچے اور اپنی چاند سی بیوی کو ان کی نرس بنا دیا۔ اماں جی نے بھی یہ خدمت دل و جان سے قبول کی۔ باپ بیٹے میں تو مفاہمت کے دروازے نہ کھلے لیکن بہو نے اپنے سسر کا دل جیت لیا۔ کچھ خوبصورتی سے کچھ خوبصورت مَن کے ہاتھوں۔ واقعی اماں جی سردار بیگم کے لیے اپنے سسر کی تیمارداری کوئی مسئلہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کھلی ہوئی مسکراہٹ، پھرتیلے ہاتھوں اور لیٹ لپیک کی سپرٹ کے ساتھ بابا جی دوست محمد خاں کی سیوا کا بیڑہ اٹھایا اور خوب نبھایا۔

مکتسر میں بابا جی محمد خاں کا حویلی نما گھر تھا۔ اس کا آنگن کشادہ اور اس کے ویہڑے میں ڈرائنگ روم کی تمام خوبیاں تھیں۔ دیہاتی ماحول کی ساری خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اصیلیں، ملازمین، اماں جی کی دیہاتی سہیلیاں، مزارعوں کی بیویاں بیٹیاں، اپنی رشتہ دار خواتین کا آنا جانا لگا رہتا۔ تنور سلگ رہے ہوتے۔ چولہے کے توے پر بھی روٹیاں دھپ دھپ پکتی چلی جاتیں۔ چارپائیاں اٹھتی چلی جاتیں۔ بچھانے کا عمل بھی اسی سرعت سے جاری رہتا۔ ان ہی چارپائیوں کو ڈائننگ ٹیبل کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ پھر ان ہی چارپائیوں پر بچوں کو نہلانے، سکھانے، مالش کرنے کے مرحلے پیش آتے۔ ان ہی چارپائیوں پر سکول سج جاتا اور مولوی صاحب قرآن پڑھانے لگ جاتے۔ استاد صاحب کے آنے پر یہی نواڑی کچھ ادوائن والی چارپائیاں مکتب کی صورت اختیار کر لیتیں۔ تختیاں دھو کر ان ہی کے پائیوں کے ساتھ سکھانے کے لیے ٹکا دی جاتیں۔ ان ہی کے گرداگرد ایک دوسرے کو پکڑنا، چور سپاہی کھیلنا بچوں کا معمول ٹھہرتا۔ دیواروں پر کپڑے سوکھتے، رضائیاں کھیس دھوپ سینکتے۔ دوپٹے لہکتے، لمبی ڈوریوں میں سبزیاں سوکھنے کے لیے لٹکتی نظر آتیں۔ ازار بند، موباف، پراندے، کمربند، ہر نوع کی کھینچنے کسنے والی چیز نظر آتی۔

اسی آنگن سے ملحق فالج زدہ بابا جی دوست محمد خاں کا کمرہ تھا۔ فارسی اردو کی کتابوں سے آراستہ حیدرآباد دکن کے دربار کی تصویروں سے سجے کمرے میں نفیس کشمیری دوشالے، کمبل سے آراستہ بستر۔ اس نستعلیق کمرے کی فضا میں ....جامی، حافظ، مولانا روم کی دانش مہکتی تھی۔ جب کبھی دو مختلف کلچر آپس میں ٹکراتے ہیں، تو ایک دوسرے پر اثر انداز

ہوئے بغیر نہیں رہتے یا اللہ تعالیٰ اسی طرح جمود توڑنے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

ہولے ہولے باہر کے اثرات اندر والے کمرے پر مرتب ہونے لگے۔ کام کرنے والیوں کی محبت نے بابا جی دوست محمد خاں صاحب کو لسی' بیسنی روٹی' سرسوں کا ساگ' کڑھی' بڑیاں کھانے کا شوق ڈال دیا۔ وہ کچی سبزیوں کو پسند کرنے لگے۔ مٹی لپی انگیٹھی میں جلتے اپلوں کی گرمی پر ہاتھ سینکنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ سر میں اماں جی سردار بیگم سے سرسوں کا تیل جھسوانے پر آمادہ ہوگئے۔

اُدھر باہر کی آبادی بھی بابا جی دوست محمد خاں کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ہولے ہولے ''جھاکا'' اُترنے لگا۔ دیہاتی عورتیں آنے بہانے بابا جی کو سلام کرنے اندر جانے لگیں۔ کبھی گرم پانی کی بوتل' کبھی بالٹی' کبھی چادر تبدیل کرنے کی خاطر' کبھی جھاڑو بہارو کو ویزا بنا کر لڑکیاں بارڈر کراس کرنے لگیں۔

نئے کلچر نے اِن کے اندر چکاچوند پیدا کردی۔ بابا جی سے جامی' حافظ' مولانا روم کے اشعار اُنہیں رٹانے شروع کردیئے۔ تلفظ خود سکھایا۔ آواز میں سے ڈنگر پن نکال کر شائستگی کی پیوند لگادی۔ اب تو لڑکیاں بالیاں ڈھولک پر فارسی غزلیں گانے لگیں۔ عورتوں نے مولانا روم کے کلام سے پندونصائح اُٹھا کر نئی پود کو عقل مت سکھانا شروع کردی۔ گھر میں حیدرآبادی کھانے تو پکتے ہی تھے سلام دعا کا طریق بھی بدل گیا۔ اب ہاتھ کا چپو بنا کر ذرا سا کمر کو لچکا کر آداب کہنے میں لطف آنے لگا۔

یہ اللہ کی عجب کارسازی ہے کہ وہ اچھے میں سے بُرا اور غلیظ میں سے پاکیزہ برآمد کرنے پر پوری طرح سے قادر ہے۔ بابا جی محمد خاں کے اندر بھڑکتے کوئلے دہکتے رہے۔ پھر سرد پڑ کر دباؤ سہہ کر چمکدار ہیروں میں بدل گئے۔ اُن کی ساری توجہ رنگ گورا کرنے' کیل مہاسے چھائیوں کے بدنما داغ دُور کرنے کی طرف مبذول ہوگئی۔

دستِ تہہ سنگ نے ایک بڑی ایجاد کو جنم دیا۔ بابا جی محمد خاں نے فیسرین کریم بنائی اور جابجا اس کی سپلائی شروع کردی۔ اب ذاتی غم وغصہ خلق کی ایک بڑی تکلیف رفع کرنے میں صرف ہونے لگا۔ پہلے یہ کریم معمولی کونڈی میں بنی۔ اسے ملانے گھوٹنے کے لیے ایک عام ڈنڈا لیا جاتا۔ ہولے ہولے جب اس کی سپلائی سارے ہندوستان میں پھیل گئی تو بابا جی نے مشینوں کا سہارا لیا۔ اماں جی پیکنگ کرنے والی عورتوں کے مابین سردار قائم ہوگئیں اور کھٹا کھٹ چھٹا چھٹ فیسرین کی بوتلیں جن پر نہایت معمولی لیبل اور اُس سے بھی ناقابلِ ذکر انداز میں فیسرین لکھا ہوتا تھا' پیک ہونے لگیں۔ مکتسر میں سنا ہے بصری تیلن اس کام میں پیش پیش تھیں۔ لاہور میں جب فیسرین پیک کی جاتی تو رحمونا ئین بڑی پھرتی سے ڈبیاں موڑتی جوڑتی اور اس میں سلیقے سے فیسرین کی بوتل پیک کردیتی۔

لیکن بابا جی دوست محمد خاں اور بابا محمد خاں میں دُوری کی فضا قائم رہی۔ بابا محمد خاں کے دل میں یہ بات جاگزیں ہوچکی تھی کہ میرے والد نے نہ کبھی میری والدہ کو اور نہ کبھی مجھے ہی قبول کیا۔ یہ زخم اتنا گہرا اور کاری تھا کہ اُن کی زندگی کا سارا تاروپود اسی زخم میں رنگا گیا۔

بابا جی محمد خاں دل کے انتہائی نرم تھے' لیکن اُن کے رویئے میں ایک ہیرے جیسی سختی تھی۔ کسی سے بغلگیر ہونا' مصافحہ کرنا' دوستانہ انداز میں ایک ہی تھالی سے کھانا' کسی لطیفے پر مل کر ہنسنا بابا جی کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ وہ الگ تھلگ'

لیے دیئے‘ پتھریلی نظروں سے دیکھتے۔ باباجی دوست محمد کے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ اپنے سانولے رنگ‘ چھوٹے قد چیچک زدہ چہرہ اُن کو یاددہانی کراتا رہا کہ ان ہی کی وجہ سے تمہارے والد کا دل تمہارے لیے ہمیشہ بند رہا۔

بڑے باباجی کسی بچے کو فارسی کی غزل رٹا کر آنگن میں ایک کرسی پر چڑھا دیتے۔ گھر کے ملازمین‘ حاشیہ بردار حاضرین اردگرد اکٹھے ہو جاتے۔ شخصیت مانجھنے خود اعتمادی پیدا کرنے میں یہ تحریک خوب کام آتی۔ بچہ بولنے کا فن جلد سیکھ جاتا۔ اُس کی زبان کھل جاتی اور جب وہ ہندوستان دھرم سکول میں اپنے سکھ اور ہندو ہم مکتبوں سے ملتا تو ایسے بات کرتا گویا سکندر کسی پورس سے ہم کلام ہو۔ بچوں میں خود اعتمادی کا یہ سارا فن باباجی دوست محمد خاں کا عطا کردہ تھا۔ سکھ استاد بھی فارسی آشنا شاہین بچوں سے ڈرتے تھے جو فرفر جامی‘ حافظ اور رومی کا کلام لحن کے ساتھ پڑھتے تھے۔

بابا محمد خاں کے گھر نو بچوں نے جنم لیا۔ عجب سی بات ہے کہ یہ بچے سب کے سب دو دو سال کے وقفے کے بعد 2 مئی کو پیدا ہوئے۔ صرف اشفاق صاحب 22 اگست 1925ء میں اس دنیا میں تشریف لائے۔ سنا ہے اسی دن بابا دوست محمد خاں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب اور اشتیاق کے درمیان ایک بچہ اور بھی تھا جسے سب کالی جھونڈی کہتے تھے لیکن وہ دو سال بعد فوت ہو گیا۔

سنا ہے کہ خاں صاحب ہو بہو اپنے دادا سے مشابہ تھے۔ اگر لحظہ بھر ”آواگون“ پر اعتبار کر لیں تو لگتا ہے بابا دوست محمد دوبارہ دنیا میں آ گئے..... اگر اسلامی روایت کے مطابق ہم اپنے باپ دادا کے گناہوں کے وارث ہیں تو عین ممکن ہے کہ اُن کی موروثی خوبیوں کے بھی امین ہیں جو ہماری Genetics میں چلی آتی ہیں۔

مرنے سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے اشفاق صاحب قدرے آرام میں تھے۔ کہنے لگے قدسیہ! شہنشاہ بابر اور گورونانک جی کا مکالمہ سنو گی۔

”کونسا مکالمہ؟“ میں نے سوال کیا۔

”بھائی سرور ازل..... منشی تلوک چند محروم کا تحریر کردہ۔“

”اچھا اچھا وہ والا۔“

”اچھی ایم اے پاس ہو اس قدر نا واقفیت۔“

”یاد تو ہے پر کچھ کم کم۔“

”جب گورونانک شہنشاہ بابر کے دربار میں پہنچے تو بابر نے بڑی شان سے بابا گورونانک کو اپنی مہمان نوازی میں شامل کیا اور گویا ہوا۔

بابر: ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خدا بابا
تو بسم اللہ جامِ بادۂ احمر چڑھا بابا
جہاں میں آبِ زر سے کون ہے پاک تر پانی
کہ دُھل جاتا ہے جس سے دفترِ ماوشما بابا
نہ مے خانے کو دیکھا چاہیے چشمِ حقارت سے

کہ ہوتی ہے یہیں سے بے خودی کی ابتدا بابا
نہ یونہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو
پہنچتی ہے نظر ان کی سرِفوق السما بابا
صداحق حق کی سنتے ہیں سدا وہ شیشہ مے سے
اسی سے دل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا بابا
جراحی کھولتی ہے راز دل جب بانگِ قلقل سے
فلک سے پکار اُٹھتے ہیں ملائک مرحبا بابا
نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دنیا بزمِ ماتم ہے
ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا بابا
غنیمت جان صحبت کو اک دو جام پیتا جا
میانِ محفلِ رنداں در و آشام پیتا جا

خاں صاحب اس لہک سے زبانی پڑھ رہے تھے گویا وہی بابر ہوں۔ پھر انہوں نے ناک پر انگلی رگڑ کر پوچھا

''کچھ یاد ہے بابا گورونانک نے کیا جواب دیا تھا؟''

''ہاں جی۔''

''اچھا سنو..... بابا نانک بولے:

مبارک ہو مئے احمر تجھے صاحبقراں تیری
رکھے بس سرور تجھ کو شرابِ ارغواں تیری
دلِ فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے
اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
مگر جب کیفیت دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا
غرض محفل سے کیا خلوت ہو جب رشکِ جہاں تیری
مئے انگور پی کر اگر کوئی متوالا ہوا تو کیا
نہ آئی دل میں مستی ہاتھ میں پیالہ ہوا تو کیا؟
وہ مئے اپنی ہے جس سے بن پیے مخمور رہتے ہیں
خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چُور رہتے ہیں
وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے بزم کا ساغر ہیں
جو صہبائے مروق سے سدا بھرپور رہتے ہیں
ہمارا دور ہے ہر سرنفس کے ساتھ چلتا ہے

اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں
کثافت روح میں آلائش دنیا سے آتی ہے
شراب ظاہری سے اہل باطن دُور رہتے ہیں
چڑھا دوان کو سولی پر بھی تو حق حق سناتے ہیں
جو عاشق ہیں وہ سرشار مئے منصور رہتے ہیں
لنڈھائے ہوں جنہوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں
کہاں وہ طالب افشردۂ انگور رہتے ہیں
مناسب ہے یہی ترک مئے انگور شاہا
ہمارے ہاتھ سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا"

نظم سنانے کے بعد انہوں نے تپائی پر پڑے ہوئے گلاس کو میری طرف بڑھایا۔ میں نے گلاس میں باقی ماندہ چند قطرے پی کر کہا..... "خاں صاحب! آپ کا کلام کا حافظہ ہے۔ آپ کو اس نعمت کا تحفہ پتہ نہیں کہاں سے ملا ہے۔"

"بابا جی دوست محمد خاں سے اور کہاں سے..... کہتے ہیں کہ ہماری Genetic Coding ہی دراصل ہماری قسمت ہے۔ شاید اسی لیے اللہ کہتا ہے کہ گناہ سے بچو۔ ہم تمہارے گناہ تمہاری آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ مجھے بابا دوست محمد خاں کا حافظہ ملا ہے..... سنا ہے جس روز وہ فوت ہوئے اُسی دن میں اس دنیا میں آیا۔ انہوں نے جانے سے پہلے اپنی وراثت Genes کی شکل میں مجھے سونپ دی تھی۔"

آفتاب بھائی اور خاں صاحب کے اندر علم کی ایک بھوک تھی جو کورس کی کتابوں سے ماورا تھی۔ وہ دونوں ڈگریاں حاصل کرنے کے درپے اس لیے رہتے کہ کہیں اندر وہ ڈاکٹر محمد خاں سے خوفزدہ تھے اور انہیں خوش کرنے کے لیے محنت کرنا چاہتے تھے۔ آفتاب بھائی نے اپنے کمرے میں یہ تختی آویزاں کر رکھی تھی۔

"اپنے باپ کی خاطر"

یہی تختی اُن کی تحریک کا باعث بنی اور وہ L.L.B. کر گئے۔

اسی خوف تلے خاں صاحب نے ایم اے اردو کیا۔ پھر اٹلی چلے گئے۔ وہاں فرانسیسی میں ڈپلومالیا۔ اطالوی سیکھی۔ اُن کا پڑھنا لکھنا مسلسل تھا لیکن وہ غالی علم کے قائل نہ جوانی میں تھے نہ بڑھاپے میں۔ اُن کے نزدیک علم ہمیشہ ٹوٹوئے تلمذ تہہ کر کے مؤدب ہو کر اپنا آپ مرشد کو ارپن کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کوئی اپنی Will سرنڈر نہیں کرتا' تربیت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ مرشد کا یہی تصور ہر عمر میں اُن کے ساتھ ساتھ رہا حتیٰ کہ مرشد ہی کی تلاش انہیں بابا نگری میں لے گئی۔ جب وہ اردو بورڈ میں ڈائریکٹر تھے تو اُن کے رفیق کار حنیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری انہیں دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ صاحب کے ڈیرے پر لے گئے' جہاں سے انہیں بابوں کی فضیلت' تربیت' اندازِ زیست کا چسکا پڑ گیا۔

بابوں کی تربیت کا جزو اعظم یہی ہے کہ پہلے انہیں خلق سے علیحدہ کر کے اللہ کی رضا تلاش کرنا ہوتی ہے۔ بابا جی اسے مستی پہرہ کہا کرتے تھے۔ جب وہ کسی انسان کے قریب نہ تھے۔ جانوروں' پرندوں کے ساتھ حشرات الارض اور